ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

اسلامی ثقافت کی روح

انیسویں صدی کے وسط میں حالی نے مسلمانوں کی پستی پر آنسو بہاتے ہوئے یہ رباعی کہی تھی:

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کوئی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اس وقت سے اب تک اسلامی اقوام کے حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ لیکن اب بھی ثقافت اور تہذیب و تمدن کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس میں دوسری مہذب اقوام مسلمانوں سے کوسوں آگے نہ نکل گئی ہوں:

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

گذشتہ دو صدیوں میں اقوامِ عالم میں عظیم الشان انقلابات ظہور میں آئے۔ طبعی سائنس کی ترقی نے علمی انقلاب پیدا کیا۔ فطرت کی مادّی تسخیر نے صنعتی اور مادّی زندگی دگرگوں کر دی۔ جمہور نے بیدار اور خود شناس ہو کر تخت و تاج تاراج کر ڈالے۔ ہر جگہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ہر جگہ مذہب کے نام پر پیدا شدہ توہم پرستی اور رجعت پسندی کا بازار سرد پڑ گیا۔ لیکن انقلابات کے اس محشر میں مسلمان اقوام کی یہی کیفیت رہی کہ:

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سودا کے جو بالیں پہ اٹھا شورِ قیامت　　　خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

مغربی اقوام مسلمانوں کی پرانی حریف تھیں۔ جیسے جیسے ان کا اقتدار بڑھتا گیا مسلمان مغلوب اور محکوم ہوتے گئے۔ حریفوں کو یہ کہنے کا موقع ہاتھ آیا کہ تمام مسلمان اقوام میں اسلام ہی ایک قدرِ مشترک ہے۔ جہاں جہاں مسلمان ہیں وہاں دو چیزیں مشترک اور دوش بدوش پائی جاتی ہیں۔ ایک اسلام اور دوسری پستی و ذلت۔ لہذا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام ہی ان اقوام کی پس ماندگی کا ذمہ دار ہے۔ ملتِ اسلامیہ جو اپنے تئیں خدا کی چہیتی ملت سمجھتی تھی یا تسلیم و رضا میں مُہر بہ لب تھی یا خدا سے شکوہ سنج۔ یہ شکوہ اقبال کے قلب سے بھی نکلا:

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

اب مسلمانوں کے ایک طبقے نے کہنا شروع کیا کہ یہ سب تباہی اس لیے آئی ہے کہ مسلمان حقیقت میں مسلمان نہیں رہے۔ اسلام کے نام لیوا ہیں لیکن اسلامی زندگی بسر کرنے پر تیار نہیں۔ قولاً توحید کے علم بردار ہیں لیکن عملاً مشرک ہیں۔ اس پر دوسرے گروہ نے کہا کہ یہ تشخیص اور تجزیہ حالات تو درست نہیں معلوم ہوتا۔ جو قومیں دنیا کی مالک ہو گئیں اور مسلمانوں پر چھا گئی ہیں ان میں کون سا اسلام یا ایمان ہے۔ کج فہم ملا اور بے بصیرت صوفی کہنے لگے کہ دنیا مومن کا قید خانہ اور کافروں کی جنت ہے۔ اصل چیز آخرت ہے جو مومنوں کے لیے مخصوص ہے۔ خواہ وہ دنیا میں کیسے ہی ذلیل اور ناکارہ معلوم ہوں۔ دنیا چند روزہ ہے۔ دولت اور حکومت آنی جانی چیزیں ہیں۔ مادی اقتدار اور مملکتوں کے عروج و زوال کو دین سے کیا واسطہ؟ جب برّو بحر میں فساد ظاہر ہو جائے تو مومن کو غاروں اور خانقاہوں میں خلوت اختیار کرنی چاہیے۔ مسلمانوں کے افکار میں جب یہ انتشار تھا اور انفرادی و اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھر رہا تھا، اس وقت مشیتِ ایزدی نے اس ملتِ خود ناشناس میں اقبال جیسا صاحبِ دل مفکر پیدا کیا۔ اس نے مسلمانوں کو یہ بتایا کہ اسلام کی ماہیت کیا ہے اور اس کی اصلی روح کیا ہے۔

اسلام ایک عالمگیر پیغامِ حیات ہے۔ محض چند عقائد کو الفاظ میں دہراتے رہنے سے

کوئی ملت نجات اور جنت کی اجارہ دار نہیں بن سکتی ۔ قرآن نازل کرنے والے خدا نے اس اجارہ داری کے متعلق یہود و نصاریٰ کو تنبیہ کی تھی، اور خود مسلمانوں کو بھی آگاہ کیا تھا کہ اگر تم نے اس دینِ فطرت سے سرتابی کی، جس کے قوانین اٹل ہیں تو دوسری قوموں کو متمکن فی الارض کر دیا جائے گا ۔ اقبال نے بھی اس دینِ فطرت پر ایک عارفانہ نظر ڈالی اور مسلمانوں کو بتایا کہ یہ دینِ فطرت اور اقدارِ حیات کے بیشتر عناصر جن اقوام کا جزوِ زندگی بن گئے ہیں انھوں نے جو ترقی کی ہے وہ اسلام ہی کی تعلیمات کو تجربۂ حیات سے اخذ کر کے اپنا لینے کی وجہ سے کی ہے :

مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

مسلمانوں کو جو تعلیم خدا کی طرف سے دی گئی تھی وہ بے کوشش ان کے ہاتھ آئی اس لیے وہ اس کی قدر و قیمت بھول گئے ۔ جن اقوام نے جد و جہد اور علم و عمل سے ان حقائق کو اخذ کیا وہ ان کے زیادہ قدر شناس ثابت ہوئے ۔ کیونکہ ان کو یہ دولت بڑی قربانیوں سے حاصل ہوئی تھی ۔ مسلمان اس سبق کو بھول گئے کہ :

میراثِ پدر خواہی، علم پدر آموز

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر اسلام، مسلمان کہلانے والی اقوام کے ہاتھوں سے نکل گیا اور ایسی اقوام کی زندگی میں عملاً زیادہ دکھائی دینے لگا جو غیر مسلم کہلاتی ہیں تو کیا مسلمان کی نجات اب اس میں ہے کہ وہ مقتدر اور مہذب اقوام کی شاگردی اختیار کر کے محض ان کی نقالی کو اپنا مشرب بنا لے؟ اقبال نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ محض نقالی اور کورانہ تقلید کبھی حقیقی زندگی پیدا نہیں کر سکتیں ۔ کورانہ تقلید ایک قسم کی ذہنی خودکشی ہے :

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

مقلدین دو قسم کے تھے ۔ ایک روایت پرست، ماضی پرست اور مشرق پرست

اور دوسرے جدّت پرست اور مغرب پرست۔ اقبال ان دونوں قسم کے مقلدوں کو کوتاہ اندیش سمجھتا تھا اور ان سے بیزار تھا۔ کبھی کبھی وہ روحِ اسلام کے بجائے روحِ مشرق کی اصطلاح استعمال کرتا تھا۔ جیسا کہ اس شعر میں

نہ مصطفٰے نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

لیکن وہ اس سے روایت پرست اور جمود پسند مشرق مراد نہیں لیتا تھا۔ چونکہ جغرافیائی حیثیت سے اسلام زیادہ تر مشرق میں ہے اس لیے وہ روحِ مشرق کو بعض اوقات روحِ اسلام کا مترادف قرار دیتا تھا۔ ورنہ شرق و غرب کے متعلق صحیح اسلامی تعلیم تو وہی ہے جو قرآن میں ملتی ہے کہ نور الٰہی لا شرقیہ و لا غربیہ ہے، اور کہتا ہے کہ اس میں کوئی خاص بھلائی نہیں ہے کہ خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کوئی شخص اپنا منہ شرق کی طرف کرے یا غرب کی طرف کرے۔ حیاتِ ابدی ایک لامکانی مشیت ہے:

بگذر از خاور و افسونِ افرنگ مشو
کہ نہ یزد بہ جوے ایں ہمہ دیرینہ و نو

اقبال کے سامنے سوال یہ تھا کہ اسلامی ثقافت کی روح کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ یہ روح ملتِ اسلامیہ میں کبھی صورت پذیر ہوئی بھی یا نہیں۔ تیسرے یہ کہ مستقبل میں اس کے صورت پذیر ہونے کی کیا توقعات ہیں اور چوتھے یہ کہ اسلام کی نام لیوا ملت کی کوئی مخصوص حیثیت اور کوئی مخصوص مشن ہے یا نہیں۔

اسلامی ثقافت کی روح کیا ہے، اس سوال کا جواب اقبال کے اشعار میں جا بجا ملتا ہے اور اس کے لیکچروں میں بھی اس کی وضاحت ملتی ہے۔ اختصار کے ساتھ اس کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اسلامی ثقافت کی بنیاد ایک نظریۂ حیات ہے جس کا مرکز و محور اسلامی توحید ہے۔ ایک خلاق ہستی ہے جو ذی شعور، علیم و حکیم ہے۔ رحمت و ربوبیت اس کی فطرت ہے۔ علم اور رحمت کے جوہر اس نے انسان کی ہستی میں ودیعت کیے ہیں۔ جس طرح خدا کی رحمت اور ربوبیت عام ہے اسی طرح انسان کا بھی یہ مسلک ہونا چاہیے کہ

اسلام کی تعلیم کے مطابق وہ اپنی استعداد کے موافق عالمگیر رحمت کو اپنا شیوہ بنائے۔ انسان کو اس لیے نہیں پیدا کیا کہ وہ محض کائنات کا تماشائی ہو یا محض عبادت کے انداز میں خدا کی خلاقی اور ربوبیت کی حمد و ثنا کرتا رہے۔ اللہ کی فطرت سے بہرہ اندوز ہو کر اس کو خود عامل اور خالق بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسلامی تصور توحید حقیقت میں ماہیتِ حیات کا تصور ہے اور اس تصور سے خاص قسم کا فکر اور خاص قسم کی زندگی بطور نتیجہ حاصل ہوتی ہے۔ اسلامی روح یہ ہے کہ انسان میں صحیح قسم کی حریت پیدا کی جائے اور اس کو ہر قسم کے خوف سے نجات حاصل ہو۔ اسلام وہ انسان پیدا کرنا چاہتا ہے جو ہر قسم کے خوف و حزن سے بالاتر ہو۔ اسلام مردِ مومن کو ربِ رحیم و علیم کا دوست اور رفیق بنانا چاہتا ہے۔

قرآن نے یہ کہا کہ انسان بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اس نے عبادت کے مفہوم میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی۔ دیگر ادیان میں عبادت زیادہ تر پوجا پاٹ کا نام تھا۔ قرآن نے سعیِ علم کو عبادت قرار دیا اور کہا کہ تمام مظاہرِ فطرت اور انفس و آفاق کے تمام کوائف آیاتِ الٰہی ہیں۔ وسیع معنوں میں کائنات صحیفۂ الٰہی ہے اور اس کے قوانین کا مطالعہ حقیقی تلاوت ہے۔ اس سے وہ بصیرت پیدا ہوتی ہے جس کی بدولت انسان کو خدا کے علم سے حصہ ملتا ہے۔ زندگی میں حکمت کی تلاش اصل عبادت ہے۔ قرآن نے ظاہری عبادت کو نہیں بلکہ حکمت کو خیرِ کثیر کہا ہے، اور خالی ظاہری عبادت والوں کو تنبیہ کی ہے کہ افسوس ہے ایسے نمازیوں پر جن کے قلب میں رحمت کا جذبہ نہیں ہے۔ اسلامی ثقافت کی روح یہ ہے کہ تلاشِ حکمت اور جذبۂ رحمت کو دین کی اساس قرار دیا جائے۔ انہی صفات کی تدریجی ترقی سے انسان خدا کا خلیفہ بن سکتا ہے۔ جو قوم حکمت سے بے بہرہ ہو اور رحمت کو فقط اپنا اجارہ تصور کر لے وہ ربِ رحیم و حکیم سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے۔ اسلام نے حکمت کے متلاشی اور علم کے طالب کو ظاہری عبادت والے عابد پر اس قدر ترجیح دی ہے کہ دونوں کی فضیلت میں کوئی نسبت نہیں رہتی۔ حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے، جہاں بھی ملے وہ اس پر قابض ہو جائے۔ مسلمانوں میں جب تک اسلام کی روح کارفرما رہی، انھوں نے ایسا ہی کیا۔ عرب میں کوئی علوم و فنون نہ تھے۔ اسلام نے مسلمانوں کو فقط ایک

زاویۂ نگاہ اور ایک اندازِ حیات عطا کیا اور وہ اس قسم کا تھا کہ باقی تمام نعمتیں اور برکتیں اس میں سے پیدا ہو سکتی تھیں۔ انگلستان کے مشہور عالم و ادیب ڈین انج نے تھیو کریسی یعنی دینی حکومتوں پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دینی حکومتیں تاریخِ انسانی میں عام طور پر علوم کی دشمن رہی ہیں، ہاں صرف ایک مستثنیٰ قوم ملتی ہے جس کی حکومت دینی تھی لیکن ابتدائی صدیوں کے مسلمان مشرق و مغرب کے علوم پر اس طرح جھپٹے جس طرح پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے۔

اسلام نے کبھی علوم کو دین کا حریف قرار نہیں دیا، اور مسلمانوں میں کبھی یہ عقیدہ پیدا نہیں ہوا کہ دین و دانش میں کوئی اساسی تضاد ہے۔ اسلامی ثقافت کا بہترین نمونہ اس کی انقلابی تحریک کے آغاز میں ملتا ہے۔ اقبال کی نظریں بھی بار بار اسی دور کی طرف اٹھتی ہیں۔ وحیِ قرآنی کی ابتدا ہی اس سے ہوئی کہ "اقرأ" پڑھ، اور اس رب کا نام لے جس نے قلم کے ذریعہ سے انسان کو علم سکھایا۔ اس کے بعد رحمتِ عامہ اور عدل کی تعلیم ہے کہ ان صفات کو فقط مومنوں کی جماعت تک محدود نہ کر دو۔ جو لوگ تمہاری طرح کے عقائد نہیں رکھتے ان کے بھی جان و مال اور آبرو کی اسی طرح حفاظت کرو جس طرح اپنے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرتے ہو۔ جتنے مغلوب اور بے کس طبقے ہیں ان کی بے کسی کو رفع کرو۔ ان کے ساتھ عدل کرو، اور ان پر رحم کرو۔ غلاموں کو آزاد کرنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ غلامی توہینِ انسانیت ہے، اور جب تک یہ قبیح رسم پوری طرح منسوخ نہیں ہوتی تب تک اتنا ضرور کرو کہ غلام کو بھی اپنی طرح کا انسان سمجھو۔

جو لوگ تمہارے عقائد نہیں رکھتے ان کے ساتھ رواداری برتو۔ دین میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے، لا اکراہ فی الدین۔ رواداری کی انتہا کر دی کہ یہ اجازت دے دی کہ ایک غیر مسلم عورت تمہاری اولاد کی ماں ہو سکتی ہے۔ اس رواداری کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اسلام کو اپنی تعلیم کی صداقت اور اس کی دل کشی پر کامل اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ غیر مسلم اگر مسلم سے رابطہ پیدا کرے گا تو مسلم کا اسلام نہیں بگڑے گا، اور غیر مسلم کی اسلام پسندی کا احتمال پیدا ہو جائے گا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عیسائی غلام تک کو یہ اجازت دی

کہ وہ چاہے تو اسلام قبول کرے اور چاہے تو اپنے آبائی دین پر قائم رہے۔ جب اس نے اپنے آبائی دین پر قائم رہنا پسند کیا تو فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ تمھیں اس کا حق حاصل ہے۔ اسلام دنیا میں اسی آزادی کو قائم کرنے کے لیے آیا ہے۔ آزادیٔ ضمیر کا جو سبق اسلام نے دیا اور جس طرح اس پر عمل کیا دنیا کی تہذیبی ترقی اس پر کوئی اضافہ نہ کر سکی۔ بلکہ بڑی مہذب اور متمدن قوموں نے افراد سے یہ حق چھین لیا۔ آج جس اسلوب مملکت کو اجتماعیت کہتے ہیں خواہ وہ مارکسزم ہو یا جرمنی کی نازیت یا مسولینی کی فاشیت، ان سب نے افراد سے یہ حق چھین لیا۔

اسلامی ثقافت کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک عالمگیر برادری کی بنا ڈالی۔ لسانی، نسلی اور جغرافیائی امتیازات کو انسانی وحدت میں حائل ہونے سے روکا۔ مغربی قسم کی وطن پرستی نسل پرستی اور رنگ پرستی مسلمانوں نے کبھی قبول نہیں کی۔ مغرب کی تقلید نے مسلمانوں میں ان مکروہ جذبات کو ابھارنے کی جابجا کوشش کی۔ لیکن قوی امید ہے کہ اسلامی ثقافت کی وحدت انگیز قوت ان سے شکست نہیں کھائے گی۔

اسلام صدیوں سے ملوکیت، ملائیت اور غلط قسم کے متصوفانہ افکار سے ملوث ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن حقیقی اسلام کے متعلق خدا کا دعویٰ ہے کہ یہ چراغ پھونکوں سے کبھی نہ بجھے گا۔ مسلمانوں میں ہر جگہ بیداری کے آثار نظر آتے ہیں۔ ہر جگہ استبداد کی زنجیروں کو توڑنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ صدیوں کا جمود اور استبداد یک بیک رفع نہیں ہو سکتا اس کے لیے کچھ وقت لگے گا۔ اس کو پہلے غیروں کے بیرونی استبداد سے نجات حاصل کرنا ہے۔ اس کے بعد یا اس کے ساتھ ساتھ اس کو ان زنجیروں کو بھی توڑنا ہے جو مذہب کے جمود اور معاشرت کی فرسودہ روایات نے اسے پہنا رکھی ہیں۔ اصلی اسلامی ثقافت وہ ہو گی جس میں عالمگیر عدل اور امن کے قیام کے لیے جہاد بھی ہو اور زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لیے اجتہاد بھی۔ جہاد و اجتہاد دونوں کے لیے علم کی ضرورت ہے کیونکہ علم ہی سے انفس و آفاق کی تسخیر ہوتی ہے۔ لیکن توحیدی ایمان کے بغیر علم فقط وہ زیر کی رہ جاتا ہے جس کے متعلق مولانا روم فرماتے ہیں کہ ایسا علم شیطان کو بھی حاصل ہے:

می شناسد ہر کہ از سِر محرم است　　زیر کی ز ابلیس و عشق از آدم است